مغربی جنوبی ہند میں اردو زبان وادب
(ماضی تا حال)

پروفیسر صغیرافراہیم

تلخیص: اردو اگر چہ کسی مخصوص خطے یا علاقے کی زبان نہیں ہے؛ لیکن جہاں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں اپنے خطے اور علاقے سے اس کی جذباتی وابستگی ضرور ہے۔اردو کے کئی مراکز وجود میں آئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اردو کی نئی بستیاں بھی آباد ہوئی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔اس مناسبت سے مغربی جنوبی ہند جو کہ آج مہاراشٹر کہا جاتا ہے،کواردو زبان وادب کے ایک اہم مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ خطہ جہاں مفکرین، مبلغین اور دانشوروں کی آماجگاہ رہا ہے، وہیں اردو زبان وادب کی کئی اہم شخصیات اسی خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔جنھوں نے اردو کیتقر یباً ہر شعری ونثری صنف میں ادب تخلیق کر کے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو زبان، اردو مراکز، جذباتی وابستگی، علاقائیت، مغربی جنوبی ہند، مہاراشٹرا

زبان وادب کیا، کسی بھی امر میں علاقائیت کا تصور پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔محدود دائرہ میں نہ ذہن وفکر کو وسعت ملتی ہے اور نہ روشن خیالی اور انسانی عظمت کا تصور اُبھرتا ہے۔ایسے مطالعہ، اور تجزیہ میں کہیں نہ کہیں لاشعوری طور پر جانب داری بھی داخل ہو جاتی ہے اور تقابلی مطالعہ میں اپنے علاقہ کا پلڑا بھاری محسوس ہوتا ہے۔

جانب داری اگر چہ ایک فطری عمل ہے اور اپنے علاقے سے جذباتی وابستگی اس سے

محبت کا ایک ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔ادبی سطح پر اِسے موضوعِ بحث بنانا مشکل مرحلہ ہے ۔قابلِ مبارک باد ہیں ، وہ محققین اور ماہرین لسانیات جنھوں نے مختلف مقامات کی درجہ بندی کرتے ہوئے زبان وادب کا عمیق مطالعہ کیا۔

ماضی کے دریچوں کو وا کرتے ہوئے غور کیجیے کہ رفتہ رفتہ برصغیر میں اردو کے جو مراکز وجود میں آئے ہیں، اور اُن کے قرب وجوار میں جو چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہوئی ہیں، وہ بستے بستے ہی بسی ہیں۔ان چھوٹے بڑے مراکز کی ادبی ولسانی سرگرمیوں کا سیر حاصل تو کیا مختصر جائزہ بھی آسان نہیں ہے۔مخلوط لسانی عمل میں دائروں کے دائرے بنتے چلے جاتے ہیں،لیکن مرکز ومحور امیر خسرو کا عہد قرار پاتا ہے۔

عہدِ خسرو کے بعد، اردو میں جنوبی ہند اور شمالی ہند کی تخصیص کے ساتھ علاقائی فضا، ماحول اور کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے کئی چھوٹے بڑے دبستان وجود میں آئے جو جغرافیائی حدود کے سبب اپنی شناخت کے مرکز بھی کہلائے مثلاً دکن، کوکن، دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، مرشدآباد، لاہور، کشمیر، رام پور، دبستان کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔خان دیس، بندیل کھنڈ، روہیل کھنڈ اور اب اُتراکھنڈ بھی اس فہرست میں شامل ہونے کا جواز پیش کرتا ہے۔ ماضی میں اس طرح کے دبستان اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور ادبی معرکوں کو وُسعت دینے کا ذریعہ تھے، مگر ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور علی گڑھ تحریک کے بعد، آفاقی ادب کے معروضی مطالعہ کے زیر اثر، آہستہ آہستہ ادب میں علاقائیت کے تصور کا رنگ وآہنگ بدلنے لگا۔جدید تحقیق وتدوین کی سہولت اور مقبولیت کی وجہ سے اس تصور نے ایک نیا، مگر دقت طلب زاویہ اختیار کیا جسے آج عالمی سطح پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔

اِس تناظر میں اگر ہم تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر دیکھیں تو اردو زبان ملک کے مختلف علاقوں میں عسکری حیثیت سے نہیں، بلکہ صوفی سنتوں کے سائے تلے بارہویں صدی عیسوی سے لشکری، کھڑی بولی، ہندوی، ریختہ کے نام سے پھلتی پھولتی رہی ہے۔عربی کا جلال، فارسی کا جمال، دکنی کی مٹھاس اور سنسکرت کی گھر کر لینے والی کیفیت اس کے رگ و ریشے میں پیوست ہے۔ اِس آویزش اور آمیزگی کی بنا پر ہی یہ روزِ اول سے تمام

ہندوستانیوں کے باہمی تعلقات کی امین رہی ہے۔مشترکہ تہذیب اور محبت واُخوت کی علامت کے طور پر اُبھرنے والی یہ زبان، ہمیشہ سے ذات پات،فرقہ وعقیدہ، دیر وحرم کی تخصیص وتمیز سے بلند نظر آتی ہے۔اِس کے رقیب بھی اِس حقیقت اوراُس کی اس حیثیت کو دل ہی دل میں تسلیم کرتے ہیں اوراچھی طرح اِس کی اِن خوبیوں سے واقف ہیں۔اس کی آبیاری، اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر کی ہے۔اس کی تشکیل وتعمیر ہی نہیں،اس کے فروغ میں بھی دونوں قوموں نے بہت اَہم کردارادا کیا ہے۔''اردو کی لسانی تشکیل''میں پروفیسر مرزاخلیل احمد بیگ یہ تک کہہ جاتے ہیں کہ:

> ''یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کے آغاز وارتقا کا سہرا صحیح معنوں میں ہندوؤں ہی کے سر ہے اور وہی اس کی پیدائش کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔''(ص،۴۱)

مولوی عبدالحق نے اسے بدیسی یا مسلمانوں کی زبان کہنے پر سخت اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے:

> ''یہ خالص ہندوستان کی پیداوار ہے اور دونوں قوموں یعنی ہندو وَں اور مسلمانوں کے لسانی،تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بنانے والے زیادہ تر ہندو ہیں۔''(خطبات عبدالحق،حصہ دوم،ص۱۸)

پروفیسر گوپی چند نارنگ''اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی رِوایت''کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان نام ہی مصالحت، محبت،آشتی اور ہم آہنگی کا ہے------یہ زبان چونکہ دو قوموں کے اختلاط، دو مذہبوں کے ارتباط اور دو تہذیبوں کے سابقے سے وجود میں آئی ہے------اس لیے قومی یکجہتی، رواداری اور اتحاد پسندی اس کے خون اور خمیر میں

ہے۔''(ص،۹)

مذکورہ عنوان کے تحت ''کدم راؤ پدم راؤ''، ''چندائن'' اور ''بکٹ کہانی'' سے لے کر، ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' تک کے ادبی سفر کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ محبت، مساوات، خلوص اور درگزر، اردو کے رگ و پے میں شامل ہے۔ اِن صفات وجہات کے پسِ منظر میں تاریخی، جغرافیائی اور لسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو جنوبی ہند، مغربی جنوبی ہند اور اب مہاراشٹر کی شکل میں اُبھرے والے طویل خطۂ ارض پر عہدِ تغلق سے عربی، فارسی اور ترکی کے اثرات تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ جو سنسکرت، دکنی، کوکنی اور مراٹھی کے ارتباط سے وجود میں آئے ہیں۔ یہاں اردو کے پھلنے پھولنے کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ کوکن کی ساحلی پٹیوں، اجنتا، ایلورا، رتنا گری اور دیو گری کے قرب وجوار کا علاقہ قدیم مراٹھی ادب، صوفی سنتوں اور تاجروں کا محبوب خطہ، پسندیدہ علاقہ رہا ہے۔ ان گنت درویشوں نے انسانی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر اسے اپنا مرکز ومحور بنایا، اور کیوں نہ بناتے کہ انھیں مقامی الفاظ کی کشش نے بھی اپنا گرویدہ کرلیا تھا جس سے مقامی باشندے اردو سے آشنا ہوئے۔ پروفیسر محمد انصار اللہ، پروفیسر جمیل جالبی اور بہمنی دور کے دیگر محققین نے یہ واضح کیا ہے کہ بریدشاہی، نظام شاہی، عادل شاہی، قطب شاہی، عماد شاہی بہمنی عہد میں، خاص طور سے گولکنڈہ، بیجاپور اور احمد نگر کے لسانی رشتوں کو مضبوطی نیز زبان کے اخذ وقبول کو فروغ، تجارتی و فوجی قافلوں کی بدولت ہی ملا ہے۔ مغلوں کے زمانے میں زبان کی آمیزش کا رنگ اور بھی نکھرنے لگا۔ چھترپتی شیواجی کے زمانے کو ملحوظ رکھیں تو مغل شہزادہ داراشکوہ گیتا کو فارسی میں منتقل کرتے ہوئے دونوں زبانوں کو قریب لا رہا تھا اُس کا منشی اور فارسی کا پہلا صاحبِ دیوان ہندو شاعر چندر بھان برہمن اس میل ملاپ کی بدولت وجود میں آنے والی زبان کے بنیادی ڈھانچے کو سیراب کرتا ہے اس کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے
پیا کے ناؤں کی سُمرَن کیا چاہوں کروں کس سیس
نہ تسبی ہے نہ سَمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

لسانیاتی ہی نہیں، ثقافتی نقطۂ نظر سے بھی آج سوال یہ اُٹھتا ہے کہ جب اس سیکولر زبان نے ہر دور بلکہ ہر مشکل گھڑی میں محبت ومُساوات کی بات کی، سب کو ساتھ لے چلی ہے، سب کو عزیز رہی ہے تو پھر 'بدیسی' کا طعنہ کیوں؟ مسلمانوں تک کیوں محدود کرنے کی چال چلی جارہی ہے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ جب اصل 'بدیسیوں' یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کا علم ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ملک کی آزادی کی خاطر بہادر شاہ ظفرؔ کو بادشاہ تسلیم کرلیا ہے تو اُنھیں اپنی پالیسی جو بظاہر بہت کامیاب نظر آرہی تھی (پھوٹ ڈالو، راج کرو) مُتزلزل ہوتی نظر آئی اور انھوں نے ایک حربہ یہ بھی استعمال کیا کہ ''اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے''۔ مصلحتاً اس کا اعلان تو نہیں کیا مگر اس کا احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ یہ زہریلا بیج ۱۷۵۷ء میں ہی انھوں نے بودیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس پہلی شاطرانہ چال کو میر جعفر جیسے لوگ تو نہیں سمجھ سکے تھے مگر رام نرائن موزوںؔ (وفات ۱۷۷۳ء) اُسی وقت سمجھ گیا تھا جب اُسے پلاسی کے میدان سے نواب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر ملی اور اُس نے فی البدیہہ یہ شعر کہا تھا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

داراشکوہ کی نگارشات، پیشوا باجی راؤ، مہاراجہ چھتر سال کے نجی اور سرکاری خطوط، فرمان اور دستاویزِ اس لسانی اتحاد کے گواہ ہیں۔ عزیز اللہ ہمرنگؔ، ریاض حسینی، لکشمی نارائن شفیقؔ، مرزا افضل بیگ، اسد علی خاں تمناؔ، بشیر الدین، خورشید علی، خلیقؔ، مفتونؔ، عبدالوہاب اور مرزا ولایت علی نے مذکورہ علاقہ میں اردو ادب کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ولیؔ اور سراج سے اسے مزید وسعت ملی ہے۔ اِن قدآور دانشوروں کے بعد مغربی جنوبی ہند ہی نہیں، ہندوستان میں اردو شعروادب کا منظر نامہ اور بھی نکھرتا ہے۔ میر تقی میرؔ کہتے ہیں۔

میرؔ کے دین ومذہب کو پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اقبالؔ جنھیں اِس خطہ سے بے پناہ اُنسیت تھی، کہتے ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے

شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

مولانا حسرتؔ موہانی کا یہ جذبۂ روحانی دیکھیے ۔

حسرتؔ کی بھی قبول ہو، متھُرا میں حاضری
سُنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے آج

محسن کاکوروی کا نعتیہ قصیدہ ۔

سَمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

اور غالبؔ نے تو کاشی کی عظمت اور روحانی برتری پر پوری مثنوی ''چراغ دیر'' لکھ دی جس کے ترجمے بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اِس گنگا جمنی رنگ کو جہاز رانی کی سہولتوں کی بنا پر بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ انگریزوں، فرانسیسیوں، پرتگالیوں کے ساتھ ساتھ بحر عرب اور بحر ہند کی لہروں سے فیض یاب ہونے والا یہ زرخیز خطۂ جسے کل مغربی جنوبی ہند اور آج مہاراشٹر کے نام سے یاد کرتے ہیں، حاجیوں کی آمد و رفت کا بھی ذریعہ رہا ہے۔ اسفار کو تاریخ کا جُز بنانے والے اصحابِ قلم رقم طراز ہیں کہ ملک کے دُور دراز علاقوں سے آنے والے حجاج کرام کو سمندری جہاز تک رخصت کرنے کے لیے عزیز و اقارب ممبئی آتے اور ''حاجی بمبا'' کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ حج و زیارت پر مبنی سفرناموں میں اس کی تہذیبی، ثقافتی اور لسانی تفصیل بھی درج ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے سفرِ حج میں خاص طور سے مخلوط ادبی منظر نامے کو اُجاگر کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کے نقوش واضح کیے ہیں۔

عقیدت و محبت کے اِس جذبہ کے ساتھ ساتھ مہاراشٹر میں اردو ادب کو فروغ دینے

میں یہاں کی تعلیمی انجمنوں اور اُن سے منسلک کتب خانوں کا بھی بہت اہم کردار رہا ہے۔ انجمن اسلام، انجمن خیرالاسلام، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کریمی لائبریری، اسماعیل یوسف کالج ولائبریری، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مسلم ایجوکیشن سوسائٹی، اس سلسلہ کے قابل ذکر ادارے ہیں۔

یہاں کے مبلغین، مفکرین اور ماہر تعلیم ، سرسید احمد خاں، نظام حیدرآباد، نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال کی اتباع میں اعلیٰ تعلیمی مراکز قائم کرتے ہوئے اردو زبان کے دائرۂ عمل کو وسیع کیا۔ سرسید ثانی، رفیق زکریا کی خدمات اِس ضمن میں بہت اہم ہیں۔ اِس خطۂ ارض کے تقریباً تمام ماہرینِ علم وادب نے مرہٹہ حکمرانوں کے تعلیمی مشن کے ساتھ، بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کی وسیع الذہنی اور وسیع القلبی کی اتباع کرتے ہوئے اپنے دائرہ فکر و عمل کو مزید مستحکم کیا اور اردو زبان وادب کو جدید ترین سہولیات سے آراستہ کیا۔ ماضی تا حال اِس کی ادبی روداد بہت طویل ہے۔ شاعری میں حسن شوخی ہوں یا آغا مرزا، عزیز اللہ ہمرنگ کی مثنوی یا ریاض حسینی کا تذکرہ، رباعی ہو یا قصیدہ، مرثیہ ہو یا شہر آشوب، اردو کی تقریباً تمام شعری اصناف نے اِس علاقہ میں مکمل عافیت محسوس کی ہے۔ یہی ادبی منظر نامہ نثری اصناف میں بھی نمایاں ہے۔ اسٹیج تھیٹر، ڈرامے اور پھر فلمی دنیا نے جدید اردو زبان کو عوام میں بے حد مقبول بنایا۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس ۹-۱۰/ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں ضرور ہوئی مگر اِسے مقبول بنانے میں مہاراشٹر کا بنیادی کردار ہے۔

مغربی جنوبی ہند کے اِس جنت نشاں سے الگ ہٹ کر ملک کے دوسرے مراکز پر نگاہ ڈالیں اور محض اردو کی تدریسی صورتِ حال کا جائزہ لیں تو آج وہاں ادبی تدریس لاشعوری طور پر ایک تثلیث کی شکل میں منقسم ہو چکی ہے۔ وہ مثلث جس کا ایک زاویہ معاشی، دوسرا تہذیبی اور تیسرا مذہبی ہے۔ بلاشبہ انگریزی نے عالمی سطح پر معاشی زبان کی حیثیت اختیار کی ہے۔ نئی نئی معلومات، تحقیقات، ایجادات زندگی کو خوشگوار بنانے میں بہت معاون ہو رہی ہیں۔ ہر سال نصاب میں اپنی ترقیات کی بنیاد پر یہ ردّ و بدل کے محرک بن رہے ہیں۔ لہٰذا معاشی اور عالمی اِفادیت کے اعتبار سے انگریزی کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مذکورۂ بالا پہلو کا دوسرا زاویہ تہذیبی ہے۔ عالم کاری کے اس دور میں اردو کی

تدریس کا یہ رُخ سب سے کمزور ہو رہا ہے جب کہ مادیت کی عینک اُتار کر دیکھیں تو نئی نسل کی تربیت کے لیے یہ لازمی عنصر ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ آج معاشیات اور کسی حد تک مذہبیات کی تعلیم کا تو معقول بندوبست ہے مگر ان دونوں کڑیوں میں اتصال پیدا کرنے والے جُز کو وہ اہمیت نہیں مل پا رہی ہے۔ اِسی وجہ سے نئی نسل خصوصاً مسلمان اپنے بزرگوں کے علمی وادبی اور سائنسی وطبی کارناموں اور ملک کی سنہری تاریخ کی اصل روح کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ان میں تہذیب وتمدن اور تاریخ کے مطالعہ سے رغبت نہ ہو۔ محبت وعقیدت جب اُکساتی ہے تو وہ ان چیزوں کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ترجمہ کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک قابل اطمینان بات ہے۔ مگر ترجمے کے ذریعے وہ روح، جذبہ، کشش اور اپنائیت برقرار نہیں رہتی اور نہ زبان کی عمدگی اور جمالیاتی حسن سامنے آتا ہے۔ ہر زبان میں محاوروں، تمثیلوں، ضرب الامثال، تلمیحات اور اشاروں کے جو معنی پوشیدہ ہوتے ہیں اور جو لاشعوری طور پر ہمیں گھر آنگن کے ماحول سے ملتے ہیں، ہمارے ذہنوں اور روزمرہ کے معمولات میں رچے بسے ہوتے ہیں، ترجمہ کے ذریعہ ان کی وضاحت اس درجہ نہیں ہو پاتی ہے۔ اس لیے ترجمے یا رسم الخط کی تبدیلی سے زبان کا اصل تاثر نہیں اُبھرتا ہے، یا وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی ہے جو اصل متن کے تحت عمل میں آتی ہے۔

تہذیب وتمدن، شخصیت کو نکھارنے، جذبات پر قابو رکھنے اور منفی سوچ کو کچلنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ان کی جڑوں میں ادب وآداب، رسم ورواج گھلے ملے ہوتے ہیں۔ وہ رسم ورواج جو ہندوستانی مسلمانوں کی اپنی ثقافت سے وابستہ ہیں اور جنھوں نے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا ہے، وہ صارفیت کے اس دور میں، براہ راست نئی نسل تک پہنچ نہیں رہے ہیں، تو بھلا وہ ذہنوں پر مثبت اثرات کیسے مرتب کر سکتے ہیں اور انھیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ ایک مسلم حکمراں نے منھ بولی غیر مسلم بہن کی عزت ووقار کو بچانے کے لیے تاج وتخت گنوایا۔ تُرک بادشاہ نے عوام کی شکایت پر شہزادے کو سخت سزا دی یا پھر صوفیہ کرام کے ان گنت واقعات جنھوں نے محبت ومساوات کے لیے اپنی زندگی وقف کی۔ ان مثبت حکایتوں، روایتوں اور قصوں کے علاوہ محرم کی سبیلیں، خانقاہوں کے لنگر، رمضان کی

رونقیں، عید کی خوشیاں ہیں لیکن جب خود مسلمان بچے اِن کی اصل روح اور جذبے کو سمجھنے سے قاصر ہوں تو وہ اس کو دوسروں تک کیسے پہنچا سکتے ہیں۔ بول چال، طرزِ تخاطب، رہن سہن، لباس، کھانے پینے کے آداب سب کا یہی حال ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات میں ایک بڑی وجہ اردو زبان وادب کو پڑھنے پڑھانے سے چشم پوشی ہے۔ گریز کا یہ رویہ ۱۹۴۷ء کے بعد خاص طور سے شروع ہوا ہے، اس کے جواز کے طور پر مختلف دلائل پیش کیے جا رہے ہیں، اور پیش بھی کیے جا سکتے ہیں۔ نیت صاف نہ ہونے کی وجہ سے بحث ومباحثہ تکرار کی شکل اختیار کرتی ہے اور نتیجہ صفر رہتا ہے۔ بقول فراقؔ گورکھپوری ؎

زمیں بدلی، فلک بدلا، مَذاقِ زندگی بدلا
تمدن کے قدیم اقدار بدلے، آدمی بدلا

راہیؔ معصوم رضا نے تو اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے خاص طور سے ان کا تحقیقی مقالہ 'طلسم ہوش ربا میں ہندوستانی عناصر' میں ان کے انگنت شواہد موجود ہیں۔ کُمار پاشی اپنی نظم 'پشپاج نگری' میں لکھتے ہیں ؎

چاروں طرف پرچھائیاں
بیچ میں جلتی آگ
منتر بولتے راکشش
سنکھ بجاتے ناگ
نگن کھڑی ہیں داسیاں
کُھلے ہوئے ہیں بال
اونگھ رہے ہیں دیوتا
جاگ رہا ہے کال

انتظار حسین اپنی خودنوشت ''جستجو کیا ہے؟'' کے صفحہ نمبر ۱۳ پر لکھتے ہیں:

''ہمارا گھر بھی خوب تھا، کہنے کو مسلمان محلے میں تھا لیکن دائیں بائیں، آگے پیچھے سب گھر ہندوؤں کے تھے۔ اصل میں یہ اُس محلے

کے بالکل آخر میں تھا جو شیخان محلّہ کہلاتا تھا۔ آگے بازار شروع ہو جاتا تھا اور ساتھ میں ہندوؤں کے گھر۔ تو، اُس گھر کی آب و ہوا اسلامی تھی مگر اردگرد کی فضا ہندوانی تھی۔ کیا خوب گھر تھا۔ چار قدم آگے چلو مندر کھڑا نظر آتا۔ چھ قدم پیچھے جاؤ تو اپنی مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔ تو میں مندر اور مسجد کے بیچ اپنی چھت پر اِس آزادی سے کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے دوڑتا تھا کہ برابر والی چھتوں کو بھی اپنے میں شمار کر لیتا تھا۔ اس محلِ وقوع سے ایک فائدہ مجھے یہ پہنچا کہ ہولی اور دیوالی کے تہوار اپنے تہوار لگتے تھے''۔

عالمگیریت اور صارفیت کے اِس ماحول میں، تہذیب وتمدن کو سمجھنے کے لیے زبان اظہارِ خیال کا ایک بڑا وسیلہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ ادب جو مادری زبان میں خلق کیا گیا ہو، مگر ثانوی زبانوں کو بھی عزت واحترام کے ساتھ معاشی اور اقتصادی سہولتیں میسّر ہوں۔ اس معاملے میں بھی مہاراشٹر کے قرب وجوار کی صورتِ حال دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں بہت بہتر ہے، جسے مثالی نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔

عرب وہند ساگر اور بنگال کی کھاڑی کے بدلتے ہوئے موسمی مزاج میں فورٹ ولیم کالج کے ذریعے درسی کتابوں کی اہمیت اور لیتھو پریس کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ مہاراشٹر میں بمبئی اور پونہ نے لیتھوگرافک پریس پر توجہ دی۔ دونوں ضرورتوں کے پیش نظر کتابیں شائع ہونے لگیں۔ گنپت کرشن نے مذہبی قصہ کہانیوں کو مرہٹی اور اردو میں چھاپنا شروع کیا۔ سیٹھ دیویکر، سکھا رام اگنی ہوتری، بال کرشن رام چند ٹھاکر نے اسے مزید وسعت اور وقار عطا کیا۔ مہاراشٹر سے باہر اسی طرز پر مزید کام ہوتا رہا جس میں نمایاں نام شیو برت لال ورمن کا ہے۔ نوآبادیاتی نظام میں اردو پریس کے جو بڑے مراکز قائم ہوئے اُن میں مہاراشٹر بھی نمایاں ہے۔ ماہنامہ نقش کوکن کے حوالہ سے پروفیسر عرفان فقیہ نے تحقیقی شواہد کھنگالے ہیں۔ پروفیسر یُونس اگاسکر اور ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اخبار ورسائل پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ اشتیاق عارف اور سید یحییٰ نشیط کی خدمات بھی اس جانب اہم ہیں۔ جوہر، روزگار، بہارِ روزگار، عندلیب ہند، آئینہ ہند، شوکت ہند، کوکبِ ہند، اخبار خادمِ ہند،

کشف الحقائق، اخبار جہاں نما، ارمغان، ارمغانِ ثاقب، کوکب ناصری، وکیل اسلام، شوکت اسلام، خیر خواہ اسلام، انقلاب، خلافت، گلدستۂ ناز، سفیر بمبئی، بمبئی تیغ بہادر، بمبئی پنچ بہادر، سلطان بہادر، سلطان الاخبار نے اردو صحافت کے اُفق کو بہت روشن کیا ہے۔

اولیا کی بستی، اورنگ آباد کو اگر مرکز بنا کر قرب وجوار کو دیکھیں تو ماضی کی نیرنگیوں میں احمد نگر، بیجا پور، گولکنڈہ، بیدر، برار، ناگپور، کامٹی جیسے شہر ہی نہیں خاندیش کے توسط سے جہاں برہانپور، جلگاؤں، دھولیہ، اُبھرتے ہیں تو بدلتے ہوئے تقاضوں اور وقت کی ضرورتوں کے ساتھ ممبئی، پونہ، ناگپور، امراوتی، وِدربھ، مالیگاؤں، مراٹھواڑہ، کوکن، بھیونڈی، لاتور وغیرہ اردو ادب کی پاسبانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دورِ حاضر میں اردو زبان سب سے زیادہ اسی خطہ ارض پر پھلتی پھولتی نظر آ رہی ہے۔ شاعری میں قاضی سلیم، حمایت علی شاعر اور بشر نواز جیسے ان گنت نام گنائے جا سکتے ہیں۔ ترقی پسندی سے قریبی رابطہ کے باوجود قاضی سلیم اور حمایت علی شاعر نے جدید شعراء میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔ دونوں فنکاروں نے نہ تو اپنے عہد کی بے یقینی اور اقدار کی شکست و ریخت سے گھبرا کر راہِ فرار اختیار کی اور نہ اپنی انفرادیت کو کھو کر سمجھوتہ کیا۔ قاضی سلیم اپنے ابتدائی دور کی نظم ''دھرتی تیرا مجھ سا رُوپ'' میں خود کو ارضیت سے اس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ دونوں کی کیفیت ایک سی محسوس ہوتی ہے۔

دھرتی تیرا مجھ سا رُوپ چاہے چھاؤں ہو چاہے دھوپ
اندھے گہرے کھڈ، پاتال سینہ چھلنی روح نڈھال
باہر ٹھنڈک اندر آگ دل میں درد، زباں پر راگ
دھرتی تیرا مجھ سا رُوپ تیری صدیاں میرے پل
وہی قیامت وہی اجل تیری مٹی میرا خمیر
تیرا خدا اور میرا ضمیر دھرتی تیرا مجھ سا رُوپ

بیج اُگے یا قبر بنے پھول کھلیں یا راکھ اُڑے
میری طرح چُپ چاپ رہے میری طرح ہر درد سہے
دھرتی تیرا مجھ سا رُوپ چاہے چھاؤں ہو چاہے دھوپ

تحقیق وتدوین میں شیخ چاند، نظام الدین ایس گوریکر، یُونُس اگاسکر اور عبدالستار دلوی جیسے محققین کی طویل فہرست ہے۔ اردو کی بہت سی تحریکات ورُجحانات بھی یہاں پروان چڑھے ہیں۔ چاہے خلافت تحریک ہو یا آزادیٔ ہند کا نغمہ۔ ادبی اعتبار سے حقیقت، رومانیت، مارکسیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بھرپور نمائندگی مہاراشٹر کی صحافتی تحریروں میں جلوہ گر ہے۔ ترسیل وابلاغ کے جدید ذرائع سے مالا مال صوبۂ مہاراشٹر میں اخبارات ورسائل کی بھی لمبی فہرست ہے۔ جس کا ذکر مذکورۂ بالا سطور میں آچکا ہے۔ عبدالسلام خورشید نے ''صحافت: پاکستان وہند میں'' لکھا ہے:

> ''بمبئی اردو صحافت کا ایک نہایت اہم مرکز تھا۔ یہاں کا سب سے اہم اخبار ''خلافت'' تھا جو مولانا شوکت علی نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام جاری کیا... اِس اخبار نے ترک موالات کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اور آزادیٔ وطن کو نزدیک لانے کے لیے بیش بہا خدمات سرانجام دیں''۔(ص:۲۵۰)

خواتین میں اردو ادب کے حوالے سے عطیہ بیگم فیضی، زہرا بیگم فیضی اور شفیق فاطمہ شعریٰ جیسی دانشوران ادب کی ایک کہکشاں مذکورہ خطّہ کے اُفق پر جگمگا رہی ہے۔ فلمی دنیا سے وابستہ قدآور ادیبوں کے جمِ غفیر نے اردو ادب کو معیار واعتبار عطا کیا ہے۔ فلم کے ہر شعبہ میں اردو ادب کا جلوہ، جلوہ گر ہے۔ مکالموں میں شگفتگی اور روانی کے ساتھ طنز ملیح کے جوہر سہراب مودی سے قادر خاں تک نظر آتے ہیں۔ کہانی اور اس کے منظر نامہ کو اردو کے مزاج ومذاق سے ہم آہنگ کرنے میں سعادت حسن منٹو سے جاوید اختر تک ایک روشن سلسلہ ہے۔ فلم کے ہر زاویہ کو ادبی تناظر میں ڈھالنے کا رویہ کے آصف سے منوج کمار اور

ناصر حسین تک جگمگا رہا ہے۔ اذیت ناک سماجی مسائل ومصائب کو نغموں کے قالب میں ڈھال دینے والے شعراء میں پریم دھون، اندیور، پردیپ، شیلیندر، آنند بخشی اور نیرج کے ساتھ ساتھ اسد بھوپالی، جاں نثار اختر، راجہ مہدی علی خاں کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شکیلؔ، مجروحؔ، ساحرؔ اور کیفیؔ فلمی دنیا کی چشمک کے ماحول میں بھی اردو زبان وادب کے معیار اور وقار کے معاملہ میں ایک دوسرے کے بے حد قریب رہے ہیں اور یہ صورت مہاراشٹر کے دوستانہ ماحول کی مرہونِ منت ہے جس کا اعتراف خود مذکورہ فنکاروں نے کیا ہے۔ مہاراشٹر کے اِسی جنت نشاں میں کیفی اعظمی اپنے دوست ساحر لدھیانوی کے بارے میں لکھے مونوگراف میں رقم طراز ہیں:

> ''میں ساحرؔ کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ وہ جتنے کامیاب شاعر ہیں اتنے ہی اچھے دوست بھی، جو خلوص اُن کے فن میں ہے وہی شخصیت میں ہے۔ احساس وتاثر کی جو شدّت ان کی نظموں میں ملتی ہے وہ زندگی میں نظر آتی ہے، جو بھولا پن اُن کے چہرے پر ہے وہی لہجے میں ہے''۔ (ص:۲۹)

جوہو اور چوپاٹی کی خوشگوار فضا نے جہاں سماجی، ثقافتی اور ادبی فروغ کے امکانات پیدا کیے ہیں، وہاں تنقیدی اور تجزیاتی شعور کو بھی جلا بخشی ہے، اور یکجہتی اور مساوات کے ماحول نے لفظ 'ساتھی' کو اعتبار واعتماد عطا کیا ہے، بلکہ ترقی پسندوں نے باقاعدہ طور پر اس کی پہل بھی مہاراشٹر سے ہی کی اور ادبی صورتِ حال کو فروغ دیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے افکار ونظریات، نگارشات اور عملی اقدامات کے تعلق سے خوب لکھا۔ تعریف بھی کی اور تنقید بھی کی، اور یہ سلسلہ ہنوز برقرار ہے۔ تئیس ۲۳ سال کی عمر میں جب ساحرؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''تلخیاں'' (۱۹۴۴ء) ادارۂ پریت نگر، بُک شاپ، لاہور سے شائع ہوا، نیز ''قومی جنگ'' (نیا زمانہ، بمبئی) میں تبصرے کے لیے آیا تو وہ کیفیؔ اعظمی کے سپرد کیا گیا۔ کیفیؔ اُسے پڑھتے ہی حیرت واستعجاب میں مبتلا ہوگئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''---میں نے اس کا مطالعہ کیا تو خوشی بھی ہوئی حیرت بھی، خوشی

اس امر کی کہ ساحرؔ کی شاعری اس الجھاؤ، ابہام اور بے روح لذتیت
سے پاک تھی جس کو جنگ کے زمانے میں نوجوان شعراء نے اپنا فن
بنالیا تھا، اور حیرت یہ ہوئی کہ ایسا ہونہار شاعر اب تک کہاں چھُپا
ہوا تھا''۔(مونو گراف 'ساحر'،ص:۷)

کیفی اعظمی نے ساحرؔ کے مجموعۂ کلام سے متاثر ہو کر جورائے پیش کی وہ ۶۴ صفحات پر مشتمل، مونوگراف کی شکل میں نئے ادب کی معمار سیریز کے تحت مارچ ۱۹۴۸ء میں نور منزل، محمد علی روڈ، بمبئی-۳ سے شائع ہوئی۔ گفتگو کے آخر یعنی انتخابِ کلام سے قبل، کیفی اعظمی نے لکھا ہے:

''میں نے یہ مقالہ آٹھ ماہ پہلے لکھا اور آج ہندوستان بدل چکا ہے۔
___ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم سے پیدا ہونے والے فرقہ
وارانہ فسادات نے ساحرؔ کے روح اور دل کو بُری طرح زخمی کر دیا
ہے اور--- دن رات کام کرنے میں مشغول ہیں۔ان کی نئی نظموں
میں نیا اُبال اور نئی شدّت ہے''۔(ص ۳۶)

مہاراشٹر کے آس پاس کے علاقوں میں اس مجموعہ کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اگلے سال مکتبہ اردو، لاہور نے اسے شائع کیا۔ پھر ملک کے دیگر علاقوں میں اس پر مذاکرے ومباحثے شروع ہوئے، کیفی اعظمی کے بھرپور تبصرے کے بعد متواتر اِس کے کئی ایڈیشن، اضافوں کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ یہی شہرت ومقبولیت فلموں سے وابستہ دوسرے فنکاروں کے حصہ میں آئی اور پورے ملک میں فصیح اردو، عوام کے دلوں پر بھی راج کرنے لگی۔

اردو ادب میں 'عورت' کو آزادانہ طور پر پیش کرنے کا نقطۂ نگاہ بھی صوبۂ مہاراشٹر کو جاتا ہے۔ منٹو اور پریم چند سے لے کر ساحرؔ لدھیانوی تک ایک طویل فہرست ہے۔ یہ زاویہ فلموں میں اور زیادہ نکھر کر آیا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ریلیز ہونے والی فلم 'انصاف کا ترازو' کا یہ شعر ہر ایک کو یاد ہوگا

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
روح بھی ہوتی ہے اُس میں، یہ کہاں مانتے ہیں

علامہ اقبالؔ،اورنگ آباد ہی نہیں مہاراشٹر کے مداح تھے۔عطیہ فیضی کے خطوط اس کے غماز ہیں۔ساحرؔ،اقبالؔ کو بہت پسند کرتے تھے۔اقبال کی یہ غزل۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ ، کیا چاہتا ہوں

کی زمیں پر ساحرؔ نے یہ نغمہ لکھا تھا۔

ترے پیار کا آسرا چاہتا ہوں
وفا کر رہا ہوں، وفا چاہتا ہوں

اقبالؔ نے کہا تھا۔

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی صفات گناتے ہوئے ساحرؔ نے فلم ''برسات کی رات'' کے لیے یہ قوالی لکھی تھی۔

عشق سرمد، عشق ہی منصور ہے
عشق موسیٰ، عشق کوہِ طور ہے
خاک کو بُت اور بُت کو دیوتا کرتا ہے عشق
انتہا یہ ہے کہ بندے کو خدا کرتا ہے عشق

اردو ڈرامہ کو مقبولیت ہی نہیں اعتبار بھی مہاراشٹر میں حاصل ہوا ہے اور فکشن میں ڈرامائی عنصر اسی سرزمین کا مرہون منت ہے۔ پارسی تھیٹر میں پیش کی جانے والی اردو تحریریں، قدیم وجدید افکار ونظریات کا سنگم تھیں۔ اردو کی وہ نگارشات ایک طرف ان صحت مند روایات واقدار اور تہذیب وتمدن کی پاسدار تھیں جو ماضی کے ہندوستان کی

شناخت ہیں تو دوسری طرف اردو ڈراموں کو پیش کرنے والے مراکز، جدید فنون لطیفہ کو ہم وطنوں میں رائج کرنے کے خواہاں تھے۔ تبھی دُور دُور سے ادیب و فنکار اس جانب کھنچتے چلے آئے۔ سماج کی اصلاح اور اردو ادب کے فروغ سے تعلق رکھنے والے ممتاز دانشور پریم چند ۳۱ رمئی ۱۹۳۴ء کو ممبئی پہنچے، حالاں کہ ۲۵ رمارچ ۱۹۳۵ء کو واپس بنارس چلے گئے لیکن مہاراشٹر سے واپسی کے بعد خلق ہونے والی تخلیقات میں ''کفن'' اور ادھورا ناول ''منگل سُوتر'' شاہکار کی حیثیت اختیار کر گئے کیوں کہ اِن میں اُن کا مشاہدہ، فکر، تخیل، زبان و بیان، فنی صلاحیتیں معراج کمال پر پہنچی ہوئی ہیں۔ فلمی تکنیک پر لکھے گئے ان فن پاروں کا انداز بیان بالکل حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ خاص طور سے افسانہ ''کفن'' کے سارے واقعات از اول تا آخر ڈرامائی انداز میں بتدریج رونما ہوتے ہیں۔ کہانی کے تمام ضروری اجزاء انتہائی سلیقے سے گُتھے ہوئے ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور مسائل ابتداء ہی سے سامنے آتے ہیں اور اُن کا تذکرہ رفتہ رفتہ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ قاری کی دلچسپی اور تجسس قائم رہتا ہے۔ پریم چند کے بعد، رومان پرور فضاؤں میں تحیّر، خوف، دہشت، رقت اور عبرت کے تمام عناصر فکشن میں اس طرح تحلیل ہوتے گئے کہ آج ہمارا افسانوی ادب عالمی سطح پر اپنا معیار و مقام حاصل کر رہا ہے اور یہ بڑی حد تک مغربی جنوبی ہند کی مستحکم ادبی فضا کی بدولت ہے، جہاں جدید ترین سہولتیں بآسانی میسّر ہیں۔

○○○